آنکھوں کے ہیرے
رضیہ فصیح احمد

یہ کس کی او۔ سی کھڑی ہے۔ میں نے ریلوے یارڈ میں کھڑے شاہانہ کمپارٹمنٹ کو دیکھ کر اپنے اسسٹینٹ بلبیر سے پوچھا۔

یہ ہندوستان کے بٹوارے سے بھی بہت پہلے کی کہانی ہے۔ میں راجھستان کے ایک چھوٹے سے شہر میں ریلوے کے محکمے میں تعینات تھا۔

صاحب، وہ اپنے سیٹھ صاحب نہیں ہیں، ڈیواڈنے کے رئیس جو اپنے کرتے میں ہیرے کے بٹن لگاتے ہیں، ان کے تین بیٹے اس کار میں رہ رہے ہیں۔

مگر کیوں؟

ان کے نوکروں سے سنا ہے کہ سیٹھ نے انھیں میلے میں پارس ناتھ جی کی زیارت کے لئے بھیجا ہے مگر یہ تین دن سے ائرکنڈیشنڈ سیلون میں پڑے ہیں، واپس جاکر باپو سے کہہ دیں گے کہ درشن کر لئے۔

تو درشن کے لئے ایک دن بھی نہیں گئے؟

کہاں، لندن پلٹ ہیں، وہ ان باتوں کو کہاں مانتے ہیں۔ یہ تو ان کے باپ اتنے سیوک ہیں کہ مندر کی مورتی کی آنکھوں کے لئے ہیرے دے دئے۔

اچھا، اور ان کے بیٹے کیا کر رہے ہیں؟

شرابیں پی رہے ہیں پڑے پڑے، کنجریاں جودھپور سے منگائی ہیں، یہاں تو کوئی ہے نہیں سوائے ایک پدما بائی کے جس نے گانا وانا چھوڑ ہی دیا۔

پدما بائی کا نام سن کر میں بھی چونکا۔ گانوں کا رسیا میں بھی تھا۔ یہ پدما بائی کون ہے میں نے پوچھا۔

صاحب، جے پور کی مشہور گانے والی تھی، اس کی آواز کے آگے کوئی ٹھہرتا نہیں تھا، مگر بس ایک دم جانے کیا ہوا کہ گانا وانا چھوڑ کر یہاں پاس کے گاؤں میں آن بسی، مندر کے علاوہ کہیں آتی جاتی نہیں اور کوئی بہت ہی شوق سے سننے آجائے تو بھجن سنا دیتی ہے۔

ہمیں سنا دیگی؟

ہاں صاحب کیوں نہیں، آپ کو بھی گانے کا شوق ہے مجھے پتہ ہے۔

تو پھر کب چلیں؟

صاحب یہ تو پدما بائی سے بات کرنی ہوگی، ہر ایک کو نہیں سناتی، میں ان کے ایک شاگرد کو جانتا ہوں، وہ اسکول میں پڑھاتا ہے، اس سے بات کروں گا۔

ہاں ضرور کرنا، اور سنو، کیا ان لونڈوں سے بات ہو سکتی ہے۔

کن سے صاحب؟

یہ جو تم نے ذکر کیا ان رئیس لڑکوں سے؟

پتہ نہیں، ان سے بھی پوچھنا پڑے گا، جیالے ہیں، من موجی ہیں، مان گئے تو مان گئے نہ مانے تو کسی کا زور نہیں چلتا بس باپو

سے ڈرتے ہیں اور کسی سے نہیں۔

ارے باپو سے بھی کیا ڈرتے ہوں گے بس یہی سوچتے ہوں گے کہ بڈھے نے جائداد سے بے دخل کر دیا تو مارے جائیں گے۔

آپ ٹھیک سمجھے ہو صاحب، وہ ہنسا۔ بے حساب پیسہ ہے۔ یہ سمجھو کہ ٹاٹا اور برلا کے بعد اس کا نمبر ہے۔ ایک دفے خود بھی انگلستان گیا تھا۔ سنا ہے اڈنبرا کوئی جگہ ہے وہاں کوئی قلعہ نما محل دیکھ آیا، بس اس کا نقشہ وہیں کے ایک انجینئر کو دیا کہ عین مین ایسا گھر بنادو، پیسے کی فکر نہ کرنا۔ گاؤں میں ایسا گھر بنادیا کہ بڑے بڑے انگریز دیکھنے کو آتے ہیں۔

تو ہمیں نہیں دکھاؤ گے!

کیوں نہیں صاحب، یہ اچھا موقع ہے، لڑکے تو تینوں یہاں پڑے ہیں، آج ہی دورہ بنالو، ہو آتے ہیں۔

بڈھا اجازت دے دیگا؟

وہ ہمارا کام ہے۔ بڈھا معمولی آدمی سے یہاں تک پہنچا ہے، اس میں ان لڑکوں والی ہیکڑی نہیں ہے۔ کوئی گھر دیکھنے آئے تو خوش ہوتا ہے۔

مگر آج تو شام ہو رہی ہے کل چلیں گے۔

ٹھیک ہے صاحب کل چلیں گے، آج کبیر صاحب سے بات کر لیتے ہیں وہ پدما بائی سے بات کر کے آپ کو لے جائیں گے۔

ہاں یہ ٹھیک ہے میں نے کہا۔

کبیر صاحب اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ خاصے پڑھے لکھے تھے اور کتابیں پڑھنے کے شوقین تھے کئی رسالے اور اخبار باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ عمر اسی گاؤں میں گزاری تھی اور یہیں گزارنے کا ارادہ تھا۔ وہ کسی زمانے میں پدما بائی کے شاگرد رہے تھے میرا شوق دیکھ کر مجھے ساتھ لے گئے۔

پدما بائی کا گھر بہت ہی معمولی جھونپڑا نما تھا، اور لگتا تھا کہ وہ دنیا سے دور، بہت تنہائی میں بسر کر رہی ہے۔ خدا معلوم کبیر نے کیا باتیں بنائیں کہ وہ مجھ سے ملنے پر راضی ہوگئی۔ اس نے میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہوگی کہ ایک بڑا افسر ان سے بھجن سننا چاہتا ہے۔ چھوٹے شہروں میں چھوٹے موٹے افسروں کا بھی بڑا مان ہوتا ہے۔ مجھے بھی گھر جا کر بچوں کی ریں پیں اور بیوی کی غیر دلچسپ باتیں سننے سے زیادہ نئے لوگوں سے ملنا اچھا لگتا تھا۔

خیر، پدما بڑی انکساری سے ملی۔ کسی زمانے میں خوبصورت رہی ہوگی، اب بھی چہرے کی جھریوں کے پیچھے ایک وقار اور آنکھوں کے دھندلکے میں ماضی کا چمکیلا غبار تھا۔

میں نے انکساری سے گانا سننے کی درخواست کی۔ وہ چپ رہی۔ مگر کچھ دیر بعد اپنا تانپورہ سنبھالا اور کچھ دیر الاپ کیا اور پھر اپنی پاٹ دار آواز میں میرا کا ایک بھجن یوں گایا کہ شام سمے میں جیسے میرا کا انتظار مجسم ہو کر دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ میں تو وجد میں آگیا۔ میرے اوپر ہر اچھی آواز، ہر اچھے گیت، غزل، پکے راگ۔ مناجاتوں اور مذہبی گیتوں کا ایک سا ہی اثر ہوتا ہے۔ کتنے سال بعد ایسی من موہنی آواز ایسے درد اور ایسے کمال کے ساتھ سنی تھی۔

میں پدما دیوی کو کچھ دینا چاہتا تھا مگر وہ ہرگز راضی نہ ہوئی، بلکہ ہماری خاطروں میں لگ گئی۔ دودھ کے گلاس کے ساتھ

رس گلے خدا جانے کہاں سے آگئے۔

بات کرنے کے لئے میں نے بات چھیڑی۔ سنا ہے آپ پارس ناتھ جی کے مندر تو جاتی ہیں۔

ہاں کبھی کبھی۔

آپ اس میلے میں نہیں گئیں؟

نہیں اب میلے ٹھیلوں میں نہیں جاتی۔ اس نے سادگی سے کہا۔

اس کے بعد اجازت لے کر ہم چلے آئے۔

واپسی میں کبیر نے کہا۔ سر آپ کو ایک بات بتاؤں؟

ہاں بتاؤ

لوگ کہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ افواہ ہو کہ پدما بائی نے یہ جوگ ان ہی سیٹھ جی کی خاطر لیا ہے جن سے ملنے کل ہم جا رہے ہیں۔

کیا تم بھی جا رہے ہو؟

ہاں سر، جب بچے چھوٹے تھے تو میں ان کو پڑھاتا تھا، میری تھوڑی بہت عزت ہے اس گھر میں۔

اچھا، کل ان سے پوچھ لیں گے۔

کیا سر؟

یہی کہ کیا پدما دیوی نے ان کے کارن جوگ لیا ہے۔

نہیں سر ایسی کوئی بات نہ کیجئے گا کہ الٹی پڑ جائے، وہ کیوں ماننے لگا کہ خود تو محل میں عیش کر رہا ہے اور اس کی خاطر کوئی عورت اپنا محل چھوڑ جھونپڑی میں رہ رہی ہے۔

ارے بھئی میں کیوں پوچھنے لگا، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم نے وہ محل دیکھا ہے؟

بس بنتے ہوئے دیکھا تھا۔ اب میرا ادھر جانا نہیں ہوتا۔ آپ کے ساتھ ہی دیکھ لوں گا۔

دوسرے دن ہم نے ادھر کا دورہ رکھ لیا۔ کبیر نے ایک دن پہلے ہی پیغام بھجوا دیا تھا کہ نئے اسٹیشن ماسٹر صاحب جو بہت پڑھے لکھے ہیں، ان کا محل دیکھنے آنا چاہتے ہیں۔

اسٹیشن سے اس گھر تک پکی سڑک لمبا چکر کاٹ کر جاتی تھی۔ ہم نزدیک کی پگڈنڈی پر ہو لئے جو خاک دھول سے اٹی جھاڑیوں کے بیچ سے گزرتی تھی۔ جب ہم اس قلعہ نما محل میں پہنچے تو سیٹھ کے مینیجر نے باہر بڑے دروازے کے آگے ہمارا استقبال کیا۔ دیواریں سلیٹی رنگ کے پتھر کی بہت اونچی تھیں۔ دروازہ بے حد بڑا اور مضبوط ترین لکڑی کا تھا جسمیں پھول نما چوڑی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔ ایک چھوٹا دروازہ الگ تھا۔ دروازے کے باہر ایک چوڑا مضبوط تخت پڑا تھا جس پر ایک منحنی سا شخص گڑمڑ یا مارے پڑا تھا۔

چھوٹے دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے تو سامنے انگریزی وضع کا ایک باغ تھا۔ اس ریگستان میں گلاب، ڈیلیا اور گلِ داؤدی دیکھ کر یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ گھر کے ایک طرف سوئمنگ پول میں فیروزی پانی تھا، دوسری طرف ٹینس کا لان تھا جسمیں جال لگا ہوا تھا اور پیچھے کی طرف نیلے رنگ کا ایک پردہ دیوار کی طرح کھنچا ہوا تھا۔ شام کو یہاں لڑکے ٹینس کھیلتے ہیں مینیجر نے بتایا۔

کس کے ساتھ کھیلتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔

آپس میں کھیلتے ہیں، ڈبل کھیلنا ہو تو مجھے بلا لیتے ہیں ورنہ دوست احباب تو آتے ہی رہتے ہیں۔

شاید ہی کوئی مہینہ جاتا ہو جب یورپ سے یا بمبئی سے ان کے دوست نہ آتے ہوں۔

تو آپ یہاں مستقل رہتے ہیں۔ کبیر نے پوچھا۔

اور کیا، میرے بغیر اس محل کا انتظام نہیں چل سکتا۔ رسوئی گھر کا، صفائی کا، بجلی پانی کا ہزاروں انتظام ہیں، اتنے نوکروں سے کام کرانا بھی ایک کام ہے۔

تنخواہ بھی خوب تگڑی ملتی ہو گی۔ میں نے مذاق کیا۔

آپ کی ریلوے کا جنرل مینیجر بھی انگریز ہے، آپ کے خیال میں اس کو کتنی تنخواہ ملتی ہو گی؟

میرے خیال میں پانچ ہزار روپئے ملتے ہوں گے۔

مجھے پندرہ ہزار روپئے مہینہ ملتے ہیں۔ اس نے فخر سے کہا۔

اچھا، مجھے حیرت ہوئی۔ خیر اندر گئے۔ سارے کمروں کے فرش میں سنگِ مرمر لگا ہوا تھا، ڈرائنگ روم میں چار پانچ الگ الگ حصے بیٹھنے کے قیمتی سوفوں کے سیٹ، ایرانی قالینوں اور دنیا بھر کے عجائبات سے مزین تھے۔ [illegible] کمروں میں مسہریوں پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے اور انکی

باریک مچھر دانیاں چھت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ کمروں میں اور لائبریری میں نایاب پینٹنگز تھیں، اور گل دانوں میں تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔

میں خود کو بار بار یقین دلا رہا تھا کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے اور میں یورپ میں نہیں راجستھان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں۔

آخر میں نے مینیجر سے یہ سوال پوچھ ہی لیا۔ حضرت یہ تو بتائیے کہ یہ محل انھوں نے یہاں ایسے گمنام گاؤں میں کیوں بنایا؟

بچوں نے تو بہت کہا کہ جودھپور، جے پور یا اجمیر میں بنا لیجئے۔ مینیجر نے کہا۔ مگر سیٹھ صاحب نے ضد پکڑ لی کہ بنے گا تو ان کے آبائی گاؤں میں ورنہ نہیں، جوان بچے بھی ہار گئے۔

کبیر نے مجھے معنی خیز انداز میں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

گھر دیکھ کر نکلے تو تخت پر سویا ہوا آدمی اٹھ بیٹھا تھا۔ مینیجر نے تعارف کروایا۔ ان سے ملئے یہ ہیں سیٹھ صاحب، اس محل کے مالک۔ میں نے ان کے ہیرے کے بٹن دیکھنے کی کوشش کی مگر ان کے تن پر کرتہ ہی نہیں تھا۔ صرف ایک دھوتی باندھے تھے۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ کر جے رام جی کی کہا۔ میں نے بھی ہاتھ جوڑ دئے۔ اتنے میں ایک لمبی سی کار آن کر رکی تینوں لڑکے سوٹڈ بوٹڈ

اس میں سے اترے۔ دونوں چھوٹے لڑکے تو فوراً اندر چلے گئے بڑا ٹھہرا رہا۔ مینیجر نے اس سے بھی میرا تعارف کروایا اور بتایا کہ میں ان کا محل دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑکے نے مجھ سے ملنے کے بعد باپ کو سلام کیا۔

پارس ناتھ جی کے درشن کر آئے۔ باپ نے پوچھا۔

ہاں۔ لڑکے نے بڑے وثوق سے کہا۔

پرشاد لائے؟

ہاں، گنگارام لا رہا ہے۔

پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر بولا۔ آپ نے بابوجی کا شاندار بیڈروم بھی دیکھا ہوگا مگر یہ یہاں تخت پر پڑے رہتے ہیں کہتے ہیں بند ایرکنڈیشنڈ کمروں میں میرا دل گھبراتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ بھی اندر سٹک گیا۔

باپ بولے۔ ارے ان لڑکوں کو میری ہر بات پر اعتراض ہے۔ کہتے ہیں لوگوں کو گھر کیوں دکھاتے ہیں، یہ میوزیم نہیں ہے، میں کہتا ہوں لوگ شوق سے دیکھنے آتے ہیں تو دکھاتا ہوں، جس دن تم ٹھکرانیاں لے آؤ گے اس دن سے نہیں دکھاؤں گا۔

میں ان کے ساتھ وہیں کھرے تخت پر بیٹھ گیا۔ کیا بات ہے آپ کے محل کی، میں نے کہا۔ آپ خرچ کرنا جانتے ہیں تبھی تو خدا نے آپ کو اتنا دیا ہے۔ اب دیکھئے کہ پارس ناتھ کی مورتی کے لئے آپ نے دو اتنے قیمتی ہیرے دے دئے، بھلا اتنا کون کرتا ہے!

یہ آپ سے کس نے کہا؟ سیٹھ نے پوچھا۔

سب ہی کو معلوم ہے۔ میں نے کہا۔

نہیں نہیں، غلط کہتے ہیں لوگ، وہ میں نے نہیں دئے وہ تو ایک خداترس مائی نے دئے ہیں۔ لوگ اس بات کا یقین اس لئے نہیں کرتے کہ اب وہ غریب ہو گئی ہے، ایک جھونپڑے میں رہتی ہے، مگر کبھی وہ بھی محل میں رہتی تھی۔

پدما بائی تو نہیں، میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

ان کا رنگ کچھ اڑا۔

آپ جانتے ہیں اس کو؟

کل گیا تھا، ایک بھجن سنا، کیا گاتی ہے! کیا بھلی آواز ہے۔ کبھی آپ بھی جا کر سنئے۔ میں نے کہا۔

سیٹھ جی کا رنگ سفید پڑ گیا

مجھے شوق نہیں۔ انھوں نے کہا۔

میں نے رخصت چاہی۔ انھوں نے ہاتھ جوڑ دئے، میرے چلنے سے پہلے ہی وہ پھر گر مڑیا مار کر تخت پر پڑ چکے تھے۔

کبیر نے کہا۔ سر ایک راز کی بات کہوں۔

ضرور کہو۔ میں نے کہا۔

یہ صرف اس لئے یہاں پڑے رہتے ہیں کہ ان کا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ یہ اس شان دار محل کے اندر رہیں جب کہ پدما بائی جھونپڑی میں رہے۔

واہ کبیر صاب، اب تم نے یہ قصہ گڑھ لیا ان کے بارے میں، کیا افسانے وغیرہ لکھتے ہو؟

میں نے پوری تحقیق کی ہے سر۔ یہ پشکر برہمن ہیں یہ کسی ایسی ویسی عورت سے شادی نہیں کر سکتے تھے، پر جوانی میں اس پر دل آ گیا تھا، ابھی تک عشق کا سبق بھولے نہیں آپ نے تو سنا ہی ہوگا ع اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا۔ میں جن دنوں بچوں کو پڑھاتا تھا کئی مرتبہ سیٹھ صاحب کے ساتھ پارس ناتھ جی کے مندر گیا ہوں اور یہ دیکھا ہے کہ سیٹھ صاحب آنکھوں کے ان ہیروں کو تکتے رہتے ہیں جو کبھی پدما بائی کے خوبصورت کانوں میں جڑے تھے۔